اسباب عروج و زوالِ امت

(۵)

عہدِ بنی عباس | خراسانیوں کے گُرزِ البرز شکن نے بنو امیہ کے قصرِ حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجادی تو اس کے کھنڈروں پر خلافتِ بنی عباس کی شاندار عمارت قائم ہوئی، یہ عمارت شاید اسوقت تک مضبوط اور پُرہیبت و جلال نہیں ہو سکتی تھی جب تک کہ اسکی مٹی کو بنی امیہ کے خون سے نہ گوندھا جاتا" اور اس کی بنیاد بیشمار انسانوں کے سروں اور ان کے اعضاء بریدہ پر نہ رکھی جاتی۔

دردناک مظالم | نہرِ زاب کے کنارہ پر اموی اور خراسانی لشکروں کے ہزاروں آدمی مارے گئے۔ اس کے علاوہ عراق اور خراساں کے دوسرے مقامات پر بیشمار انسانوں کا خون بہایا گیا۔ مگر ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ صرف اسی پر قناعت نہیں کی گئی۔ مروان مصر کے ایک مقام بوصیرہ میں قتل کر دیا گیا۔ اس کے قتل ہونے سے پہلے ہی کوفہ میں بماہِ ربیع الاول ۱۳۲ھ خاندان بنو عباس کے پہلے خلیفہ ابو العباس سفاح کیلئے بیعت لے لی گئی تھی۔ مگر اس کے باوجود ان لوگوں کی آتشِ انتقام پھر بھی سرد نہیں ہوئی۔ اور بنو امیہ کے ایک ایک آدمی کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر قتل کیا گیا۔ سفاح کے چچا داؤد بن علی نے مکہ اور مدینہ میں۔ اور عبداللہ بن علی نے شام میں اموی خاندان کے یا اس خاندان کے ساتھ ہمدردی رکھنے والے جس کسی شخص کو پایا بیدریغ سپردِ تیغ کر دیا۔ پھر صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ابن اثیر الجزری کا (تاریخ الکامل ج ۵، صفحہ ۱۵۴ تا صفحہ ۱۶۲) بیان ہے کہ سلیمان بن علی گورنر بصرہ نے تو یہانتک کیا کہ بہت سے اموی جو بیش قیمت لباس زیب تن کئے ہوئے تھے ان کو بصرہ میں قتل کرایا، اور اس کے بعد پیروں میں رسیاں بندھوا کر ان کی بے گور و کفن نعشوں کو شاہراہِ عام پر ڈلوا دیا، جہاں ان کے جسم کتوں کیلئے سامانِ ضیافت بنے۔ عبداللہ بن علی کی آتشِ انتقام زندہ انسانوں کے قتل کرنے

نہ بچی تو اس نے بنو امیہ کے جلیل القدر خلفاء امیر معاویہ، عبد الملک بن مروان اور ہشام بن عبد الملک تینوں کی قبریں کھدوائیں۔ ہشام کی نعش بجز اس کی ناک کے بانسہ کے بالکل صحیح سالم تھی۔ اس کو کوڑوں سے پٹوایا۔ ابن اثیر نے بنو امیہ پر مظالم کے اس سے بھی زیادہ دردناک واقعات لکھے ہیں جن کو پڑھکر انسانیت اور شرافت لرزہ براندام ہو جاتی ہیں یہاں ان کو بیان کرنا چنداں ضروری نہیں ہے۔

جوشِ انتقام میں ان لوگوں کا توازنِ دماغی کس درجہ معطل ہو گیا تھا۔ اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ سفاح کے پاس سلیمان بن ہشام بن عبد الملک بیٹھا ہوا تھا اور سفاح اس کے ساتھ تعظیم و تکریم کا معاملہ کر رہا تھا۔ اتنے میں سدیف نامی ایک شاعر آیا اور اس نے ذیل کے دو شعر پڑھے ؎

لا یَغُرَّنَّکَ ما تریٰ من رجال اِنَّ تَحْتَ الضلوعِ داءً دَوِیًّا
فَضَعِ السیفَ وارفعِ السوطَ حتّٰی لا تریٰ فوق ظَہرِہا اُمَوِیًّا

ترجمہ:۔ اے سفاح تجھکو یہ لوگ جنھیں تو دیکھ رہا ہے کہیں دہوکہ میں مبتلا نہ کر دیں، ان کی پسلیوں میں چھپی ہوئی بیماریاں ہیں۔ یعنی ان کا دل صاف نہیں ہے۔ تو تلوار سے کام لے اور کوڑا اٹھا، یہانتک کہ زمین کی پشت پر ایک اموی کو بھی زندہ نہ چھوڑ۔

ان اشعار کو سنتے ہی سفاح محل میں چلا گیا اور اس کے بعد ہی سلیمان کو پکڑ کر قتل کر دیا گیا۔ پھر بنو امیہ پر ہی کیا موقوف ہے جن لوگوں پر آلِ علی کی حمایت اور ان کی طرفداری کا شبہ تھا ان کے ساتھ بھی اسی قسم کا برتاؤ کیا گیا۔ غرض یہ ہے کہ اس طرح اُس شاندار حکومت کا آغاز ہوا جس کے عہد کو مسلمانوں کی تاریخ کا "عہدِ زریں" کہا جاتا ہے اور جس پر ہمارے مورخین فخر کرتے ہوئے ذرا نہیں شرماتے۔

سفاح کا قول و عمل بیعتِ خلافت کے وقت ابو العباس سفاح نے جامع کوفہ میں جو خطبہ دیا تھا اس میں اس نے بڑے فخر سے کہا تھا "اللہ نے اپنے دین کو ہمارے ذریعہ مضبوط کیا۔ اور ہم کو اس کا قلعہ اور پناہ گاہ بنایا۔ ہم اس دین کی حفاظت کرنیوالے اور اس کے لئے دشمنوں سے لڑنیوالے ہیں۔ اللہ نے ہم کو

تقویٰ اور طہارت کا پابند بنایا ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت کا شرف عطا فرما کر ہم کو تمام لوگوں میں سب سے زیادہ مستحق خلافت کیا ہے۔" اس کے بعد سفاح نے قرآن مجید کی چند آیات پڑھی ہیں جن میں ذوی القربیٰ کے حقوق کا ذکر ہے۔ پھر بنو امیہ اور اہلِ شام پر سب وشتم کیا ہے اور رنگین بیانی سے کام لیکر ان کو خلافت کا غاصب اور انتہائی ظالم وجابر ثابت کیا ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ وہی اہلِ کوفہ جنھوں نے جگر گوشۂ رسول امام حسینؑ کے ساتھ بیوفائی کی جو اُن کی مظلومانہ شہادت کا سبب بنی۔ سفاح ان لوگوں کو خطاب کرکے کہتا ہے کہ" اے اہلِ کوفہ! میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم سب ہماری محبت اور مودت کا مرکز ہوا اور تم وہی ہو کہ زمانہ کے حوادث اور ظلم وجبر کی فراوانیاں بھی تم کو ہم سے برگشتہ نہیں کر سکے اور ہمارے متعلق تمہارے رویہ میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا، اسلئے تم ہمارے نزدیک سب سے زیادہ سعادتمند اور معزز و مکرم ہو۔ اور میں نے آج سے تمہارے عطیات میں سو سو دراہم کا اضافہ کردیا ہے۔ خطبہ کے آخر میں اپنی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے۔" فانا السفاح المبیح والثائر المنیح" میں خون کو مباح سمجھنے والا خونریز ہوں اور شدید انتقام لینے والا ہوں"۔

ابو العباس سفاح اسوقت تپ زدہ ہو رہا تھا اس سے زیادہ نہ بول سکا اور یہاں تک تقریر کرکے گھر میں چلا گیا۔ اس کے بعد سفاح کا چچا داؤد بن علی منبر پر آیا اور اس نے ایک طویل تقریر کی۔ اس تقریر میں کئی جگہ داؤد نے کہا ہے کہ خلافت ہمارا حق ہے جو براہِ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بطور میراث ہم کو پہنچتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے اس حق کو غصب کرنیوالے ہلاک ہوگئے اور یہ حق پھر ہم کو واپس مل گیا۔ داؤد نے صرف اسقدر کہنے پر ہی بس نہیں کیا بلکہ اس نے پوری جرأت اور ڈھٹائی سے یہانتک کہدیا" تم سب لوگ اچھی طرح سن لو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سے اب تک بجز امیر المومنین حضرت علیؓ اور امیر المومنین عبداللہ بن محمد یعنی ابو العباس سفاح کے اس منبر پر کوئی صحیح معنی میں خلیفہ بیٹھا ہی نہیں ہے"۔

اب ذرا ایک طرف سفاح اور داؤد بن علی ان دونوں کے خطبات کو پڑھئے اور دوسری جانب ان کا

عمل دیکھئے اور پھر بتائیے کہ کیا اسلام میں غدر، فریب، جھوٹ، اور مکاری و بے ایمانی کی مثال کوئی اس سے بھی بدتر ہو سکتی ہے؟ دعویٰ یہ ہے کہ ہمارے برابر کوئی خلیفہ برحق ہوا ہی نہیں۔ یہانتک کہ حضرت ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم بھی خلیفہ نہیں تھے، لیکن عمل ہو بہو اس شعر کا مصداق ہے۔

گلۂ جفائے وفا نما جو حرم کو اہلِ حرم سے ہے
کسی بتکدہ میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری

اسباب خواہ کچھ ہوں لیکن اس میں ذرا شبہ نہیں کہ مسلمان ہمیشہ اپنی اس بدقسمتی پر روئیں گے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا سے تشریف لیگئے ابھی پورے سوا سو سال بھی نہیں ہوئے تھے کہ مسلمانوں نے ایک ایسی حکومت قائم کی جس کی بنیاد محض جوشِ انتقام، عربوں سے نفرت و عداوت اور خود غرضی پر قائم تھی۔ اور اس بنا پر اس کو قائم کرنے اور اسے مضبوط بنانے کیلئے وہ سب کچھ کیا گیا جو اسلامی شریعت میں ناجائز و ناروا تھا۔ عربی کی ایک مثل کے مطابق بنو امیہ اگر نباش اول (پہلے گورکن) تھے تو اس میں شبہ نہیں کہ بنو عباس نباش ثانی (دوسرے گورکن) تھے اور اسلئے موخر الذکر کے مقابلہ میں اول الذکر بہرحال رحمۃ اللہِ علی النباش الاول کے مستحق تھے۔

سعید الفطرت وہ لوگ ہوتے ہیں جو دوسروں سے عبرت پکڑیں اور نصیحت حاصل کریں مگر بنو عباس نے ایسا نہیں کیا۔ ان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ بنو امیہ کے زوال میں دو چیزوں کو بہت بڑا دخل ہے۔ ایک حد سے زیادہ جبر و تشدد ظلم و جور اور سفاکی و بے رحمی۔ اور دوسرے خلیفہ کا اپنی زندگی میں ایک چھوڑ دو دو بلکہ تین تین کو اپنا ولیعہد بنانا۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے بھی اپنا رویہ یہی رکھا۔ اور اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی۔

ولی عہد بنانے کے ہولناک نتائج متوکل باللہ کے زمانہ تک خلفاء کا دستور یہی رہا کہ وہ اپنی حیات ہی میں اپنی اولاد میں سے کسی کو یا بھائی اور بھتیجہ کو یا دونوں کو یکے بعد دیگرے اپنا ولیعہد بنا دیتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ قصرِ خلافت میں زہر خورانی کے واقعات پیش آتے تھے۔ باہمی سازشیں ہوتی تھیں۔ یہانتک کہ سخت ترین

جنگ وجدال کی نوبت بھی آجاتی تھی اور اس طرح اعزا و اقربا آپس میں میل ملاپ اور صلح و آشتی کے ساتھ رہنے کے بجائے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے رہتے تھے۔ اور اس سے شاہی محلات کی زندگی کے ابتر اور پریشان ہونے کے ساتھ ساتھ رعایا کی زندگی بھی ایک عجیب کشمکش میں بسر ہوتی تھی۔ انتہا یہ ہے کہ اس طرزِ عمل سے بعض اوقات باپ اور بیٹوں تک میں شرمناک واقعات پیش آجاتے تھے جن کا کوئی مسلمان تو کیا ایک معمولی درجہ کا انسان بھی تصور نہیں کرسکتا۔ متوکل باللہ عباسی کے متعلق صاحب شذرات الذہب (ص ۱۱۴ ج ۲) کا بیان ہے۔

وھو الذی احیا السنۃ واماتَ التجھم   اس نے سنت کو زندہ کیا اور جہمیت کو فنا کیا۔

لیکن اس محیِ سنت کا بھی حال یہ تھا کہ اس نے پہلے تو اپنے تین لڑکوں منتصر، معتز اور موید کو اپنا ولیعہد مقرر کردیا۔ لیکن چونکہ معتز کی ماں سے جو صبیحہ نام کی ایک لونڈی تھی محبت زیادہ کرتا تھا اس لئے بعد میں اس کی رائے ہوئی کہ منتصر سے ولیعہدی سے علیحدگی کا اقرار نامہ لکھالے اور اس کے بجائے معتز کو اپنا قائم مقام بنادے۔ منتصر نے اس کو گوارا نہ کیا۔ اور غیظ و غضب کی آگ نے برافروختہ ہوکر اس کو باپ کے قتل کردینے پر آمادہ کردیا۔ چنانچہ شوال ۲۴۷ھ میں متوکل اپنے وزیر فتح بن خاقان کے ساتھ بیٹے کے ہاتھوں قتل کردیا گیا۔ جس بیٹے کا اپنے باپ کے ساتھ یہ سلوک ہو وہ اپنے دونوں بھائیوں کے ساتھ جو کچھ بھی کرتا کم تھا باپ کو قتل کرنے کے کچھ دنوں بعد منتصر نے اپنے دونوں بھائیوں کو مجبور کیا کہ ولیعہدی سے الگ ہوجائیں معتز نے کچھ مخالفت کی۔ مگر آخر کار موید اور معتز دونوں کو منتصر کا حکم ماننا پڑا۔

ترک غلاموں کا اقتدار

متوکل کی موت کے بعد خلافت بنی عباس کا پورا اقتدار ترک غلاموں کے ہاتھ میں آگیا تھا وہ جس کو چاہتے تھے خلیفہ بناتے تھے اور جب اُس سے ناراض ہوتے اسے الگ کردیتے بلکہ نہایت وحشیانہ طریقہ پر طرح طرح کی ایذائیں دیکر قتل کردیتے تھے۔ خود متوکل منتصر کے ایما سے ترک غلاموں کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ اسی طرح ان غلاموں نے مستعین باللہ کو کچھ دنوں قید رکھا پھر گردن

اڑادی۔ معتز باللہ کو جبکہ وہ حمام میں نہا رہا تھا کھولتے ہوئے پانی میں غوطہ دیکر مار ڈالا۔ مہتدی کو انھیں بیرحموں نے نشانۂ ظلم و ستم بنایا۔ ابن المعتز کو گلا گھونٹ کر انھیں ظالموں نے شہید کیا۔ مقتدر باللہ کو اس وحشیانہ طریقہ پر قتل کیا کہ پہلے تلوار سے گردن اڑادی پھر سر کو نیزہ پر اٹھا کر اس کی نمائش کی اور تمام جسم عریاں کر دیا۔ قاہر باللہ کی آنکھوں میں ایک آگ میں تپتی ہوئی سلاخ پھیری اور اس طرح اسے تڑپا تڑپا کے ختم کیا۔ اسی طرح خلیفہ مستکفی باللہ کے پاؤں میں رسی باندھکر اسے زمین پر گھسیٹتے ہوئے لیگئے اور پھر آنکھوں میں لوہے کی سلاخ ڈالکر اس کا خاتمہ کر دیا۔ متقی باللہ کے ساتھ بھی اسی قسم کا معاملہ ہوا۔ خلیفہ مسترشد باللہ پر اچانک سترہ آدمیوں نے چاقوؤں سے حملہ کر کے اس کے جسم کو پارہ پارہ کر دیا اور ناک کان کاٹ کر انھیں آگ میں جلا دیا۔ راشد باللہ کو اس کے بیٹے کے ساتھ بہت دنوں تک قید میں رکھا۔ یہانتک کہ پھر دونوں قیدخانہ میں ہی جان بحق ہو گئے۔ پھر سب سے آخر میں خلیفہ مستعصم باللہ کا جو حشر ہوا اس کو سنکر بھی بدن پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ وزیر ابن علقمی کی سازش سے تاتاریوں نے اس کو گرفتار کیا اور ایک تھیلہ میں بند کر کے اس کو روند ڈالا گیا اور اسی پر خلافت بنی عباس کا چراغ جو مدت سے ٹمٹما رہا تھا ہمیشہ کیلئے بجھ گیا۔

خلافتِ عباسیہ کے دو دور | عہد بنی عباس کو تاریخی طور پر دو دوروں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور جو تاریخ کی عام زبان میں اس خلافت کا عہد زریں کہلاتا ہے ۱۳۲ھ سے شروع ہو کر معتصم باللہ کے آخر عہد حکومت ۲۲۷ھ تک ممتد ہے۔ اس کے بعد سے دوسرے دور کا آغاز ہوتا ہے جو ۶۵۶ھ میں آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ کے بغداد میں قتل ہونے پر منتہی ہو جاتا ہے۔

دورِ انحطاط | یہ آخری دور عباسیوں کا دور انحطاط ہے جس میں دربارِ خلافت کا اقتدار تقریباً بالکل ختم ہو گیا تھا غلاموں۔ خواجہ سراؤں اور عورتوں کا عمل دخل امور سلطنت میں بہت بڑھ گیا تھا اندرونِ ملک شورشیں برپا تھیں۔ مختلف صوبوں میں طوائف الملوکی اور خود مختاری پیدا ہو چلی تھی۔ یہانتک کہ متعدد صوبوں میں حکومتیں اور ریاستیں قائم ہو گئیں یہ حکومتیں کہنے کو تو دربارِ خلافت سے وابستہ تھیں اور ان کا کوئی

سلطان دربارِ خلافت سے سندِ سلطانی حاصل کیے بغیر سلطنت نہیں کر سکتا تھا مگر اپنے اندرونی معاملات میں یہ سلطنتیں آزاد تھیں، پھر جو سلطان دربارِ خلافت سے تقرب حاصل کرنا چاہتا تھا اس کی سیدھی ترکیب یہ تھی کہ جن غلاموں یا خواجہ سراؤں کا خلیفہ پر اثر ہوتا تھا وہ اس کو کافی رشوت دیکر خلیفہ سے جو چاہتا تھا کام نکال لیتا تھا۔

امور سلطنت میں عجمی غلاموں کا یہ عمل دخل منصور کے زمانہ سے ہی شروع ہو گیا تھا، اگر معاملہ غلاموں کو سرکاری عہدے دینے تک ہی محدود رہتا تو یہ کوئی ایسی بری بات نہ تھی۔ غضب تو یہ ہوا کہ منصور نے جتنے بڑے بڑے عہدے تھے وہ عجمیوں کو دیدیئے اور جو اشراف عرب میں شمار ہوتے تھے ان کو عجمیوں کا ماتحت بنا دیا۔ چنانچہ ابو ایوب الموریانی الخوزی کو جو ایرانی تھے وزیر بنایا اور ابن عطیۃ الباہلی جو خالص عربی النسل تھے ان کو عامل مقرر کیا، ادھر رفتہ رفتہ سلطنت کے ذمہ دارانہ عہدے اور مناصب عجمیوں بلکہ ترک غلاموں کے قبضہ میں آرہے تھے جن کے دلوں میں اسلامی تعلیمات نے ابھی پورے طور پر گھر نہیں کیا تھا۔ اور ان کے دماغوں سے جاہلیت کے رسوم و عادات کے نقوش بالکل نہیں مٹے تھے اور اُدھر محلات شاہی میں ملک ملک کی لونڈیوں نے خلفاء اور شہزادوں کے اقلیمِ دل میں اپنی حکمرانی کا سکّہ چلانا شروع کر دیا تھا۔ تدریجی طور پر یہ دونوں اثرات اپنا کام کرتے رہے۔ یہانتک کہ خلافت بنی عباس کے دوسرے دور میں خلافت محض برائے نام رہ گئی۔ خلیفہ کہنے کو خلیفہ تھا مگر دراصل اس کا دماغ اور دل۔ اور اس کی سیاسی طاقت وقوت سب مفلوج تھے اور وہ لونڈیوں اور غلاموں کے رحم وکرم پر جیتا تھا، ان خلفاء کے القاب اب بھی کروفر کی شان رکھتے تھے۔ مگر جاننے والے جانتے تھے کہ ان ریشمی غلافوں کے اندر ایک جسمِ ناتواں چھپا ہوا ہے "جو ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ" ہونے کی بھی سکت نہیں رکھتا۔ عربی کے ایک شاعر ابن ابی شرف نے بادشاہانِ اندلس کے پرشکوہ القاب پر ایک مرتبہ طعن کرتے ہوئے کہا تھا۔

ممّا یزھدنی فی ارض اندلسٍ   اسماءُ معتمدٍ فیھا ومعتضدِ
القابُ مملکۃٍ فی غیر موضعھا   کالھرّ یحکی انتفاخاً صورۃ الاسدِ

ترجمہ:۔ جس چیز نے مجھکو اندلس سے برگشتہ کردیا ہے وہ وہاں کے بادشاہوں کا معتمد اور معتضد جیسے نام رکھنا ہے، یہ سلطنت کے القاب بالکل بے محل ہیں۔ ان کی مثال اس بلی کی سی ہے جو پھولکر شیر کی نقل اتارتی ہے۔"

یہ شعر بعینہ خلافتِ عباسیہ کی ان کٹ پتلیوں پر بھی صادق آتے ہیں جن کی ڈور محلِ شاہی کی کسی نازک اندام جاریہ کے دستِ سیمیں میں ہوتی تھی یا کسی غلام نافرجام کی انگشت آہن سرشت میں۔

وزارت کی ابتری جب خلافت بے دست وپا ہو چکی ہو تو پھر وزارت کا حال جو کچھ بھی ہو کم ہے اس کی ابتری اور پریشاں حالی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ منصب وزارت حاصل کرنے کیلئے بیش قرار رشوتیں پیش کی جاتی تھیں اور اس طرح دربار خلافت سے اُس شخص کو پروانۂ وزارت مل جاتا تھا جو زیادہ سے زیادہ رقم دیسکے۔ اگرچہ اس اہم عہدہ کی صلاحیت اس میں بالکل بھی نہ ہو۔ چنانچہ فخری کا بیان ہے کہ چوتھی سدی ہجری میں ابن مقلہ نے پانچ لاکھ دیناروں کی رشوت دیکر راضی باللہ سے وزارت کا عہدہ حاصل کیا، اسی طرح ابن جہیر نے قائم بامراللہ کو تیس ہزار دنانیر کی گراں قدر رقم پیش کی تھی اور اس کے عوض منصب وزارت خریدا تھا۔ رشوت ستانی کے سلسلہ میں ایک نہایت شرمناک اور حیرت انگیز واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ کوفہ میں ناظر امور عامہ کی ایک جگہ خالی تھی، مقتدر باللہ کے وزیر خاقانی نے اس جگہ کے لئے ایک دن میں انیس آدمیوں سے رشوت لی اور ان میں سے ہر ایک کو اس منصب کا پروانہ لکھکر دیدیا اب یہ لوگ روانہ ہوئے تو اتفاق سے راستہ میں ایک مقام پر سب کا اجتماع ہوگیا یہاں ان کو اس واقعہ کا علم ہوا تو انھوں نے آپس میں فیصلہ کیا کہ انصاف کی بات یہ ہے کہ ہم میں سے جو شخص وزیر کے پاس سب سے آخر میں گیا تھا اس کو ہی کوفہ پہنچکر یہ عہدہ سنبھالنا چاہیے۔ کیونکہ اس کے پروانہ کے لئے کوئی ناسخ نہیں ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا، سب سے آخر میں جس شخص کو کوفہ کی نظارت کا

فرمان ملا تھا وہ کوفہ چلا گیا اور باقی سب وزیر کے پاس لوٹ آئے۔ اب وزیر نے ان لوگوں کو متفرق کام سپرد کر دیئے۔"

یہ روایت فخری کی ہے ممکن ہے من وعن صحیح نہ ہو۔ تاہم اس عہد کے عام حالات جو کم وبیش تمام تاریخوں میں مذکور ہیں ان کے پیش نظر یہ کوئی مستبعد اور ناممکن الوقوع بات نہیں ہے۔ چنانچہ ایک شاعر نے اس وزیر کی ہجو میں کہا بھی ہے۔

وزیرٌ لا یَمَلُّ من الرقاعہ　　یُوَلِّی ثُمَّ یعزل بعد ساعۃٍ
ویُدْنی من تعجل منہ مالٌ　　ویبعد من توسَّل بالشفاعَۃ
اِنَّ اھل الرشا صاروا الیہ　　فاحظی القومِ اوفرھم بضاعَۃٌ

ترجمہ:۔ یہ ایسا وزیر ہے جو رقعہ لکھنے سے اکتاتا نہیں ہے۔ وہ ایک شخص کو والی بنا دیتا ہے پھر ایک گھنٹہ بعد اسے معزول کر دیتا ہے۔ جن لوگوں کی طرف سے اُس کو جلدی رشوت موصول ہو جاتی ہے اسے اپنا مقرب کر لیتا ہے۔ اور جو لوگ سفارش کو اپنا وسیلہ بناتے ہیں انھیں اپنے سے دور کر دیتا ہے۔ بے شبہ اہلِ رشوت اُس کے آس پاس جمع رہتے ہیں اور جو سب سے بڑا مالدار ہوتا ہے وہی اس کے نزدیک سب سے زیادہ کامیاب رہتا ہے۔"

اب خود غور فرمائیے جس مملکت میں عہدے اور منصب بکتے ہوں، جہاں عیاشی اور رندی وبدمستی عام ہو۔ اور جہاں کے خلفاء اور امراء پرلے درجے کے بے حس، خود غرض، آرام طلب، عشرت کوش اور بے مغز وبے دماغ ہوں اس کو صحیح معنی میں خلافت کہنا تو درکنار۔ کیا اسے ایک مسلم اسٹیٹ بھی کہا جا سکتا ہے؟

یہ تھا اس دور کا حال جس کو خود تاریخ بھی خلافتِ عباسیہ کا دورِ زوال کہتی ہے۔ اب آیئے ذر اس دورِ اول کا جائزہ لیجیئے جسے عام طور پر خلافتِ عباسیہ کا عہدِ زریں کہا جاتا ہے؟ مگر یہ عہدِ زریں خالص اسلامی نقطۂ نظر سے مسلمانوں کیلئے کس حد تک سرمایۂ فخر و مباہات ہے؟ اس کا اندازہ اس بات سے

ہو سکتا ہے کہ مامون رشید جو اِس دور کا گل سرسبد ہے۔ مولانا شبلی نعمانی اس کے مسلک و مشرب کو اس شعر کا مصداق بتاتے ہیں ؎

کس کی ملت میں گنوں آپ کو بتلائے شیخ
تو کہے گبر مجھے گبر مسلماں مجھکو

علوم وفنون کی ترقی اور زوال امت میں اسکا اثر

اس دور کا سب سے بڑا قابلِ فخر کارنامہ یہ ہے کہ اس میں مسلمانوں نے اسلامی علوم وفنون کی تدوین کی۔ اور دوسری زبانوں سے علوم فلسفہ وحکمت کے تراجم کیے۔ صرف تراجم ہی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ اُن علوم کے مسائل پر روشن دماغی کے ساتھ غور و خوض کر کے ان کی تنقید کی۔ ان کے معائب و اسقام کو طشت ازبام کیا۔ اور مختلف علوم وفنون کی تدریس و اشاعت کیلئے مکاتب اور مدارس بلکہ یونیورسٹیاں قائم کیں۔ علمار کے گرانقدر وظائف اور مشاہرے مقرر تھے اور وہ اطمینان سے اپنے علمی کاموں میں شب و روز مصروف و مشغول رہتے تھے پھر علمی کاموں کے علاوہ صنعت و حرفت۔ فنِ تعمیر اور شعر و ادب کو بھی بہت کچھ ترقی ہوئی۔ ادب و تاریخ کی کتابوں میں جو واقعات مذکور ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرد تو مرد عورتیں بلکہ باندیاں تک اس زمانہ میں شعر و ادب کا بہت ستھرا اور شستہ مذاق رکھتی تھیں۔ بات بات میں شعر کہتیں اور حاضر جوابی میں اپنا مثال نہیں رکھتی تھیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ یہ علوم وفنون کی ترقی اور شعر و ادب کی گرم بازاری مسلمانوں میں بڑی حد تک ان میں دماغی بلند پروازی اور ذہنی ثقافت و عروج کے پیدا ہو جانے کا سبب ہوئی۔ لیکن میں نہایت صفائی کے ساتھ یہ عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اس سے اسلامی عقائد کی سادگی اور راسخ العقیدتی کو صدمۂ عظیم پہنچا اور یونانی علوم وفنون کی گرم بازاری نے خالص اسلامی افکار کو ایسی ضرب کاری لگائی کہ مسلمان عقیدہ و خیال کی وحدت سے کٹ کر ایک نہایت خطرناک قسم کی دماغی لامرکزیت میں مبتلا ہو گئے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا کہ شرعی اور آلہیاتی مسائل کے متعلق

ان کا طریق فکر بدل گیا اور وہ ایک نئے انداز سے ہی اسلامی عقائد وافکار پر غور کرنے لگے، یہ نیا اندازِ فکر بے شبہ اس طریقِ فکر سے مغائر تھا جو قرآن مجید نے اپنے مخصوص اسلوبِ بیان اور طریقِ استدلال کے ذریعہ مسلمانوں میں پیدا کیا تھا اور جس کی وجہ سے ان میں مابعد الطبیعیاتی حقائق کا اذعان اس درجہ پختہ اور مضبوط ہوگیا تھا کہ اس کو کوئی طاقت متزلزل نہیں کر سکتی تھی۔ قرآن مجید کا ایک عام اصول یہ ہے کہ وہ پہلے کسی چیز کی نسبت ایک خاص قسم کا فکر پیدا کرتا ہے۔ پھر اس فکر کو شواہد ونظائر کے ذریعہ یقین کی صورت بخشتا ہے۔ اس کے بعد جب یہ یقین جذبہ کی شکل میں منتقل ہوجاتا ہے تو اب اس پر ان اعمال صالحہ کی شاندار عمارت قائم ہوتی ہے جن کے بغیر کوئی مدنیت مدنیت صالحہ نہیں بن سکتی۔ افسوس ہے کہ یہاں تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ اجمالاً ایمان باللہ کو لیجئے۔ قرآن انسان کے ضمیر ووجدان کو بیدار کرکے خدا کے وجود اور اس کی صفات کا یقین پیدا کرتا ہے اور فلسفیانہ دلائل کی موشگافیوں میں نہیں الجھاتا یعنی جس طرح ایک نابالغ بچہ اپنے ماں باپ کو پہچانتا اور ان کے ماں باپ ہونے کا یقین رکھتا ہے مگر اس کا یہ یقین اس احساسِ تعلق پر ہی مبنی ہوتا ہے جو ماں باپ کی اس کے ساتھ غیر معمولی محبت وشفقت اور اس کے ہر قسم کے آرام وآسائش کا خیال رکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ اس سے متجاوز ہوکر اس کو والدین کے زناشوئی تعلقات کا علم بالکل نہیں ہوتا اور غالباً اسی وجہ سے بچہ کو اپنے ماں باپ کے ساتھ جو شیفتگی اور گرویدگی اور ان کے امر ونواہی کو بجالانے کی جو آمادگی اس زمانہ میں ہوتی ہے وہ جوان ہوجانے کے بعد اس وقت نہیں رہتی جبکہ اس کو والدین کے زناشوئی تعلق کا علم ہوجاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح سمجھئے کہ قرآن مجید انسانوں کو خدا کے وجود اور اس کی صفات کا جو یقین دلاتا ہے اس کے لئے وہ وہی طریق استدلال اختیار کرتا ہے جس طریق سے ایک بچہ اپنے ماں باپ کے ماں باپ ہونے کا یقین رکھتا ہے۔ یہی طریقہ فطری ہے اور اس راہ سے انسان جس چیز کا یقین پیدا کریگا اس پر اعمالِ صالحہ کی بنیاد قائم ہوسکیگی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جہاں کہیں منکروں اور کافروں کی جہالت کا ذکر کیا ہے

ان کے متعلق یہ نہیں کہا کہ ان لوگوں کے دماغوں میں عقل نہیں ہے۔ بلکہ ان کے قلوب کے سربمہر ہونے کا ماتم کیا ہے مثلاً "لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا"[۵] یا "خَتَمَ اللّٰهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ" اور ایک جگہ ارشاد ہے "أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا"

بہرحال یہ ہے وہ طریقِ فکر جو قرآن نے مسلمانوں میں پیدا کیا اور جس سے ان میں عقیدہ و عمل کی استواری پیدا ہوئی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ عہد صحابہ و تابعین میں مسلمان خدا کی نسبت صرف اسقدر جانتے اور اس پر ایمانِ کامل رکھتے تھے کہ خدا خالقِ کائنات ہے۔ ازلی اور ابدی ہے اور اس کی ذات تمام صفاتِ حسنہ کی مستجمع ہے لیکن عہد بنی عباس میں جب یونانی فلسفہ کا زور ہوا تو اب مسلمانوں نے خدا کی نسبت بھی ایک دوسرے انداز سے سوچنا اور غور کرنا شروع کر دیا۔ مثلاً انھوں نے ایک طرف خدا کو علتِ تامہ یا علتِ اولیٰ و مطلقہ کہا۔ اور دوسری جانب چونکہ فلسفۂ یونان کا کلیہ "الواحد لا یصدر عنہ الا الواحد" "ایک۔ سے صرف ایک ہی صادر ہو سکتا ہے" ان کے نزدیک ناقابلِ تردید تھا۔ اس بنا پر انھیں عقول عشرہ ماننے پڑے۔ ان دونوں مسلمات سے یہ صاف ظاہر ہے کہ اسلام نے خدا کی نسبت جو یقین دلایا ہے وہ اپنی اصلی حالت میں باقی نہیں رہ سکتا۔ مثلاً قرآن کہتا ہے کہ خدا کے لئے مشیت ہے۔ ارادہ ہے اور اس سے جو افعال صادر ہوتے ہیں وہ اضطراراً نہیں بلکہ اختیار سے صادر ہوتے ہیں وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو نہیں چاہتا وہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ لیکن فلسفۂ یونان کی اصطلاح کے مطابق اگر خدا کو عالم کیلئے علۃ تامہ کہا جائے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ خدا کیلئے نہ مشیت ہے اور نہ ارادہ ہے۔ اور اس سے جو کچھ بھی صادر ہوا ہے اس میں خدا کے

---

[۵] عربی زبان میں تفقہ کے معنی وجدان سے کسی بات کو معلوم کر لینے کے ہیں جسکا تعلق قلب سے ہے۔ عقل سے جو بات دریافت ہوتی ہے اس کیلئے ادراک یا تعقل وغیرہ الفاظ بولے جاتے ہیں۔ بجائے عقل و فہم کے جس کا موضع سر ہے کافروں کے دلوں کا ذکر کرنا اور ان کو خالی از تفقہ بتانا اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ قرآن مجید جو یقین انسان میں پیدا کرنا چاہتا ہے اس کیلئے وہ انسان کی عقل کے بجائے اس کے ضمیر و وجدان سے اپیل کرتا ہے۔

اختیار کو کوئی دخل نہیں بلکہ بالاضطرار ہوا ہے۔ کیونکہ علتِ تامہ سے معلول کا صدور اختیار سے نہیں ہوتا پھر چونکہ علتِ تامہ اور معلول کے درمیان زمانہ کے اعتبار سے کوئی تقدم اور تاخر نہیں ہوتا اس لئے فلاسفہ کو ماننا پڑا ہے کہ خدا کی طرح عقلِ اول بھی قدیم بالذات ہے۔ اب خود غور فرمائیے کہ خدا کو عالم کی علت اولیٰ و مطلقہ قرار دیکر اگر اس کو مشیت۔ ارادہ اور اختیار سے محروم مان لیا جائے تو پھر اسلام تو درکنار کسی ایک مذہب کی عمارت بھی قائم رہ سکتی ہے۔ ؟

وجود کی طرح خدا کی صفات کی نسبت بھی موشگافیاں کی گئیں اور اس سلسلہ میں عجیب عجیب طرح کی بحثیں پیدا ہوئیں۔ مثلاً پہلی بحث تو یہ تھی کہ صفات کا ذاتِ خداوندی کے ساتھ تعلق کیا ہے؟ یعنی وہ عین ذات ہیں یا غیر ذات۔ یا نہ عین ہیں اور نہ غیر پھر دوسری بحث یہ تھی کہ ان صفات کی حقیقت کیا ہے؟ یعنی اگر علم بغیر معلوم کے نہیں ہو سکتا تو جب خدا کے سوا کوئی شے بھی موجود نہ تھی اس وقت خدا کیونکر علیم ہوگا؟ پھر خدا کی ذات وصفات سے قطع نظر دوسرے مسائل میں بھی اسی طرح کی نکتہ سنجی اور دقیقہ رسی کی گئی۔ مثلاً یہ کہ بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہے یا نہیں؟ انسان مجبور محض ہے یا مختارِ مطلق۔ یا نیم مجبور و نیم مختار۔ عقلی اعتبار سے تین احتمالات نکلتے تھے وہی تینوں احتمالات مستقلاً تین فرقوں کی بنیاد قرار پا گئے۔ اور اس کا اثر عقیدۂ ثواب و عقاب پر ہوا۔ اسی سلسلہ میں قرآن کے متعلق بحثیں ہوئیں کہ وہ مخلوق ہے یا غیر مخلوق۔ اور اگر مخلوق ہے تو پھر وہ اللہ کا کلام کیونکر ہوا؟ اور اگر غیر مخلوق ہے تو اس میں شانِ حدوث کیوں پائی جاتی ہے؟ غرض یہ ہے کہ اس عہد میں شریعتِ اسلام کا کوئی نظری یا عملی مسئلہ ایسا نہیں تھا جس کو فلسفہ اور عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش نہ کی گئی ہو۔ طبعی طور پر اس کا جو نتیجہ ہونا چاہیئے تھا وہی ہوا مسلمانوں میں دماغی پراگندگی اور ذہنی انتشار پیدا ہوگیا، افکار و آراء کے مختلف اسکول قائم ہوگئے۔[1] اور عہد بنی امیہ میں چند در چند عملی کمزوریوں کے باوجود مسلمان

---

[1] اگر آپ کو اس بحرانِ دماغی کی روئداد معلوم کرنی ہو تو علامہ عبدالکریم شہرستانی اور ابن حزم ظاہری کی کتاب الفصل فی الملل والنحل پڑھیئے ✣

اب تک جس مصیبتِ عظمیٰ سے محفوظ تھے یعنی عقیدہ وخیال کی کمزوری اور ابتری اب وہ اس کا بھی شکار ہو گئے۔

علمِ کلام فلسفہ اور مذہب کے امتزاج سے علم کلام کی بنیاد پڑی، جس کے معنیٰ یہ تھے کہ کسی شرعی حقیقت پر ایمان لانے کیلئے صرف قرآن اور حدیث کا بیان کافی نہیں ہے بلکہ وہ اسوقت تک درخورِ پذیرائی نہیں ہوگی جب تک کہ فلسفہ کی بارگاہ سے اس کی صحت کا فتویٰ صادر نہیں ہو جائیگا۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ لوگوں نے علم کے ذریعۂ اعلیٰ وحی والہام کو چھوڑ کر اس کے ذریعۂ ادنیٰ یعنی فلسفہ و استدلال منطقی کو اپنا ملجا و ماوی بنا لیا۔ ایک یقین کی شاہراہ کو ترک کر کے ظن وگمان کے راستہ پر پڑ لینے کا جو نتیجہ ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ اسی بنا پر شروع شروع میں علمأ اسلام نے علمِ کلام کی شدید مخالفت کی اور اس کے پڑھنے پڑھانے کو ممنوع قرار دیا۔ چنانچہ امام شافعیؒ تو یہاں تک فرماتے تھے "اہلِ کلام کے بارہ میں میرا حکم یہ ہے کہ ان لوگوں کو کوڑوں اور جوتوں سے پٹوایا جائے۔ اور قبیلوں اور محلوں میں ان کو ذلت کے ساتھ پھرایا جائے اور یہ اعلان ہوتا رہے کہ یہ سزا ہے اُس شخص کی جس نے کتاب اور سنت کو چھوڑ کر اہلِ بدعت کے کلام پر توجہ کی۔" مگر جب انھوں نے دیکھا کہ دربارِ خلافت کی سرپرستی کے باعث یہ سیلاب رکتا نہیں بلکہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے اور اسلامی عقائد وافکار کی بنیادیں متزلزل ہونے لگی ہیں تو اب انھیں مجبوراً ادہر کا رخ کرنا پڑا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر امام غزالیؒ کے اثر سے دین کی سادہ تعلیمات کو سلطان سنجر کے دربار کی امداد واعانت حاصل نہ ہوتی تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ عباسی خلافت کے اس دورِ زریں کا لگا ہوا یہ شجر زہر اثر کیا رنگ دکھاتا۔ اس دور میں جن لوگوں نے دینی حقائق کی صحت کو معلوم کرنے کا ذریعہ فقط عقل کو بنایا اُن کی مثال اُس احمق کی سی ہے جو کسی گز سے سمندر کے پانی کو ناپنے کی کوشش کرتا ہے اور آخر کار سمندر کی وسعتوں اور پانی کی لہروں میں اپنے دیدۂ امتیاز کی صلاحیتوں کو گم کر کے بیٹھ رہتا ہے۔ اسی وجہ سے عارف رومی نے فرمایا ہے۔

پائے استدلالیاں چوبیں بود" یعنی دین قیم کی منزل وہ نہیں ہے جو اس مصنوعی پاؤں سے سر ہو سکے۔[1]

خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں جو گمراہیاں پیدا ہوئی ہیں ان کا سرچشمہ دو ہی چیزیں ہیں ایک حکومت و سلطنت کا فاسد نظام جس کی داغ بیل بنوامیہ کے ہاتھوں پڑی، دوسری چیز علوم و فنونِ عقلیہ کی گرم بازاری ہے جس کی سرپرستی کا شرف بنو عباس کو حاصل ہے اور جس کو اس دور کا سب سے بڑا قابلِ فخر کارنامہ کہا جاتا ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے کسی کو یہ مغالطہ نہیں ہونا چاہیے کہ اسلام علم کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا یا علوم و فنون کی ترقی اسلام کی اسپرٹ کے منافی ہے بلکہ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اصل چیز اسلامی وجدان ہے۔ اسلامی وجدان اگر زندہ ہے تو پھر خواہ کوئی علم حاصل کیا جائے (بشرطیکہ وہ وہم و سفسطہ میں مبتلا نہ کر دیتا ہو) کسی مسلمان کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جس فلسفہ نے الحاد و زندقہ عام کر دیا۔ اُسی فلسفہ کی درسگاہ سے امام غزالیؒ۔ امام رازیؒ۔ ابن رشد اور حافظ ابنِ تیمیہؒ وغیرہ ائمۂ اسلام پیدا ہوئے، ان حضرات نے فلسفہ سے دین کی خدمت کا کام لیا۔ یہ نہیں کیا کہ دین کے لئے فلسفہ کو معیار بنا دیا ہو" ہارون اور مامون رشید کے زمانہ میں یونانی علوم و فنون کے جو تراجم ہوئے ان میں زیادہ تر دخل یا تو غیر مسلموں کا تھا اور جن مسلمانوں کا دخل تھا ان میں اکثریت ایران سے تعلق

---

[1] حضرت علیؓ فرماتے تھے " اگر دین کا دار و مدار قیاس (عقل) پر ہوتا تو باطنِ خف (چرمی موزہ) پر مسح کرنا ظاہرِ خف پر مسح کرنے سے اولیٰ ہوتا" مولانا رومیؒ کا مشہور شعر ہے۔

گر باستدلال کارِ دیں بدے
فخر رازی رازدارِ دیں بدے

مولانا محمد قاسمؒ نانوتوی کو ایک مرتبہ سرسید احمد خاں نے لکھا " حضرت! دین کی کوئی بات عقل کے خلاف نہیں ہونی چاہیے" مولانا نے جواب میں لکھا " آپ نے الٹا کر دیا۔ اصل یہ ہے کہ عقل کی کوئی بات دین کے خلاف نہیں ہونی چاہیے"۔

خلافت عباسیہ میں جو گمراہیاں پھیلیں ان کا سرچشمہ یہی تھا کہ اس دور میں علوم عقلیہ کی گرم بازاری کے باعثِ دین کو عقل کے مطابق کرنے کی کوشش کی گئی۔ گویا یہ پہلے ہی تسلیم کر لیا گیا کہ عقل تو سراسر بے قصور اور بے خطا ہے۔ بنوامیہ کے دور آخر میں اس تحریک عقلیت کا آغاز ہو گیا تھا مگر اس کا عروج خلافتِ عباسیہ میں ہوا۔ جبکہ فلسفہ کی شکل میں اس کا ایک بظاہر قوی مددگار پیدا ہو گیا۔

رکھنے والوں کی تھی جن کے دلوں میں اسلامی عقائد اچھی طرح جانشین نہ ہوئے تھے اس بنا پر دراصل تباہی کا راز ہی یہ ہے کہ جو چیز دینی معلومات کیلئے اصل تھی یعنی قرآن و حدیث اس کو ثانوی حیثیت دیدی گئی اور جس چیز کو بعد میں رکھنا تھا اسے پہلے درجہ میں رکھا گیا۔

علاوہ ازیں یہ بات بھی فراموش نہ کرنی چاہیے کہ عقلی علوم دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو اشیاءِ عالم کے خواص۔ ان کے نفع و ضرر اور ان کے طرق استعمال وغیرہ سے بحث کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے علوم کے ساتھ اسلام کا کوئی تصادم نہیں ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے علوم وہ ہیں جو حقائق مابعد الطبیعی سے بحث کرتے ہیں۔ ان علوم کی نسبت بے شبہ اسلام کا رجحان یہ ہے کہ آپ ان کو حاصل تو کر سکتے ہیں بلکہ حق یہ ہے کہ انھیں حاصل کرنا چاہیے۔ لیکن ساتھ ہی یہ ضروری ہے کہ آپ عقل کو اُس کے اپنے دائرہ عمل تک محدود رکھیں اور الٰہی تعلیمات کی نسبت آپ کا یقین ایسا قوی ہونا چاہیئے کہ اگر ان دونوں میں تعارض نظر آئے تو آپ کو وحی و الہام پر شک و شبہ کرنے کے بجائے اپنی یا فلاسفہ کی عقل کا تخطیہ کرنے میں باک نہ ہو۔ غرض یہ ہے کہ اولاً ایک مسلمان بچہ کی تربیت اور تعلیم خالص اسلامی ہونی چاہیئے۔ اور جب اسلام کی تعلیمات اس کے دل اور دماغ پر چھا جائیں اور اس کا ذوق دینی پختہ تر ہو جائے تو اب وہ جو علم چاہے حاصل کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ علم علوم مفیدہ کی فہرست میں شامل ہونے کے لائق ہو۔"

(باقی آئندہ)

مکتبہ برہان کی ایک نئی کتاب

نعتِ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

ہندوستان کے مشہور و مقبول شاعر جناب بہزاد لکھنوی کے نعتیہ کلام کا دلپذیر و دلکش مجموعہ، جسے مکتبہ برہان نے تمام ظاہری دل آویزیوں کے ساتھ بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ بہترین نرم سنہری جلد قیمت ۹ر

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ برہان قرول باغ، دہلی